

تفہیم القرآن

الذاریات

(۲)

ابراہیمؑ نے کہا، اُسے فرستادگانِ الہی، کیا تمہم آپ کو درپیش ہے؟ انہوں نے کہا ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اُس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسادیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں“۔ پھر ہم نے اُن سب لوگوں کو نکال لیا جو

۱۔ چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا کسی بڑے اہم کام کے لیے ہوتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی آمد کا مقصد پوچھنے کے لیے خطب کا لفظ استعمال فرمایا۔ خطب عربی زبان میں کسی معمولی کام کے لیے نہیں بلکہ کسی امرِ عظیم کے لیے بولا جاتا ہے۔

۲۔ مراد ہے قوم ٹوٹ۔ اُس کے جرائم اس قدر بڑھ چکے تھے کہ صرف ”مجرم قوم“ کا لفظ ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس سے مراد کون سی قوم ہے۔ اس سے پہلے قرآن مجید میں حسبِ ذیل مقامات پر اس کا ذکر گزر چکا ہے:

تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۱ تا ۵۳ - ۳۵۵ تا ۳۵۹ - ۵۱۰ تا ۵۱۵ - جلد سوم، ص ۱۴۰ - ۵۲۶ تا ۵۳۱ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۹۲ تا ۵۹۸ - جلد چہارم، القافات، ص ۳۰۶ -

۳۔ یعنی ایک ایک پتھر پر آپ کے رب کی طرف سے نشان لگا دیا گیا ہے کہ اُسے کس مجرم کی سرکوبی کرنی ہے۔ سورہ ہود اور الحج میں اس عذاب کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اُن کی بستیوں کو ٹپٹ کر دیا گیا اور اوپر سے پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے۔ اس سے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ شدید زلزلے کے اثر سے پورا علاقہ اٹھ دیا گیا اور جو لوگ زلزلے سے بچ کر بھاگے ان کو آتش فشاں مادے کے پھروں کی بارش نے ختم کر دیا۔

اُس سستی میں مومن تھے، اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔ اس کے ۳۳ بیچ میں یہ قصہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے یہ فرشتے کس طرح حضرت لوط کے ہاں پہنچے اور وہاں اُن کے اور قوم لوط کے درمیان کیا کچھ پیش آیا۔ یہ تفصیلات سورہ ہود، الحجر اور العنکبوت میں گزر چکی ہیں۔ یہاں صرف اُس آخری وقت کا ذکر کیا جا رہا ہے جب اس قوم پر عذاب نازل ہونے والا تھا۔

۳۳ یعنی پوری قوم میں، اور اُس کے پورے علاقے میں صرف ایک گھر تھا جس میں ایمان و اسلام کی روشنی پائی جاتی تھی، اور وہ نہ تھا حضرت لوط علیہ السلام کا گھر تھا۔ باقی پوری قوم فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی تھی، اور اُس کا سارا ملک گندگی سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس ایک گھر کے لوگوں کو بچا کر نکال لیا اور اس کے بعد اس ملک پر وہ تباہی نازل کی جس سے اس بدکار قوم کا کوئی فرد بچ کر نہ جاسکا۔

اس آیت میں تین اہم مضامین بیان ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ کا قانون مکافات اُس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس میں کچھ قابلِ لحاظ بھلائی موجود رہے۔ مجرے لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں اگر ایک قلیل عنصر بھی ایسا پایا جاتا ہو جو بدی کو رد کرنے اور نیکی کے راستے کی طرف بلانے کے لیے کوشاں ہو، تو اللہ تعالیٰ اُسے کام کرنے کا موقع دیتا ہے اور اُس قوم کی مہلت میں اضافہ کرتا رہتا ہے جو ابھی خیر سے بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔ مگر جب تک یہ ہو جائے کہ کسی قوم کے اندر آٹے میں نمک کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو دو چار نیک انسان اس کی بستیوں میں بُرائی کے خلاف لڑتے لڑتے تھک کر عاجز آچکے ہوں انہیں وہ اپنی قدرت سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو ہر ہوشمند مالک اپنے شرے ہوئے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ”مسلمان“ صرف اُسی امت کا نام نہیں ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے، بلکہ آپ سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان کے پیرو بھی مسلمان ہی تھے۔ ان کے ادیان الگ الگ نہ تھے کہ کوئی دین ابراہیمی ہو اور کوئی موسوی اور کوئی عیسوی۔ بلکہ وہ سب مُسلم تھے اور ان کا دین ہی اسلام تھا۔

بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔^{۳۵}

قرآن مجید میں یہ حقیقت جگہ جگہ انتہی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں: البقرہ، ۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳۔ آل عمران، ۶۷۔

المائدہ، ۴۴، ۱۱۰۔ یونس، ۷۲، ۸۴۔ یوسف، ۱۰۱۔ الاعراف، ۱۲۶۔ النمل، ۳۱۔ ۴۲، ۴۴۔

تیسرے یہ کہ ”مومن“ اور ”مسلم“ کے الفاظ اس آیت میں بالکل ہم معنی استعمال ہوئے ہیں اس آیت کو اگر سورہ حجرات کی آیت ۴ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اُن لوگوں کے خیال کی غلطی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ”مومن“ اور ”مسلم“ قرآن مجید کی دو ایسی مستقل اصطلاحیں ہیں جو ہر جگہ ایک ہی مفہوم کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور ”مسلم“ لازماً اُسی شخص کو کہتے ہیں جو ایمان کے بغیر معصن بظاہر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورہ حجرات، حاشیہ ۳۱)۔

۳۵۔ اس نشانی سے مراد بحیرہ مُردار (DEAD SEA) ہے جس کا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم اُشانِ تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کا اندازہ ہے کہ قومِ لوط کے بڑے شہر غالباً شدید زلزلے سے زمین کے اندر دھنس گئے تھے اور ان کے اوپر بحیرہ مُردار کا پانی پھیل گیا تھا، کیونکہ اس بحیرے کا وہ حصہ جو ”اللسان“ نامی چھوٹے سے جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے، صاف طور پر بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے اور قدیم بحیرہ مُردار کے جو آثار اس جزیرہ نما کے شمال تک نظر آتے ہیں وہ جنوب میں پائے جانے والے آثار سے بہت مختلف ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جنوب کا حصہ پہلے بحیرے کی سطح سے بلند تھا، بعد میں کسی وقت دھنس کر اس کے نیچے چلا گیا۔ اس کے دھنسنے کا زمانہ بھی دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے، اور یہی تاریخی طوفان پر حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کا زمانہ ہے۔ پچھلے سال ۱۹۶۵ء میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کرنے والی ایک امریکی جماعت کو اللسان پر ایک بہت بڑا قبرستان ملا ہے جس میں ۲۰ ہزار سے زیادہ قبریں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر ضرور آباد ہو گا۔ مگر کسی ایسے شہر کے آثار اس پاس کہیں موجود نہیں ہیں جس

اور دتھا سے یہ نشانی ہے، موسیٰ کے قصے میں جب ہم نے اُسے صریح سند کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا تو وہ اپنے بل بوتے پر اکر گیا اور بولایہ جادو گر ہے یا مجنون ہے۔ آخر کار ہم نے اُسے اور اس کے لشکروں کو یکپڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا۔

سے متصل اتنا بڑا قبرستان بن سکتا ہو۔ اس سے بھی یہ شبہ تقویت پاتا ہے کہ جس شہر کا یہ قبرستان تھا وہ بچرے میں غرق ہو چکا ہے۔ بچرے کے جنوب میں جو علاقہ ہے اس میں اب بھی ہر طرف تباہی کے آثار موجود ہیں اور زمین میں گندھک، رال، کول تار اور قدرتی گیس کے اتنے ذخائر پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی وقت بجلیوں کے گرنے سے یا زلزلے کا لاوا نکلنے سے یہاں ایک جہنم بھٹ پڑی ہوگی و مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۲۹ تا ۵۳۱۔

۳۶ یعنی ایسے صریح معجزات اور ایسی کھلی کھلی علامات کے ساتھ بھیجا جن سے یہ امر مشتبہ نہ رہا تھا کہ آپ خالقِ ارض و سما کی طرف سے مامور ہو کر آئے ہیں۔

۳۷ یعنی کبھی اُس نے آپ کو ساحر قرار دیا، اور کبھی کہا کہ یہ شخص معجون ہے۔

۳۸ اس چھوٹے سے فقرے میں تاریخ کی ایک پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے۔ اس کو سمجھنے

کے لیے فدا حشمِ قصود کے سامنے یہ نقشہ لے آئیے کہ فرعون اس وقت دنیا کے سب سے بڑے مرکزِ تہذیب و تمدن کا عظیم فرمانروا تھا جس کی شوکت و سطوت سے گرد و پیش کی ساری قومیں خوف زدہ تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ وہ جب اپنے لشکروں سمیت اچانک ایک روز غرقاب ہوا ہوگا تو صرف مصر ہی میں نہیں، اُس پاس کی تمام قوموں میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی ہوگی۔ مگر اس پر بجز اُن لوگوں کے جن کے اپنے قریبی رشتہ دار غرق ہوئے تھے، باقی کوئی نہ تھا جو ان کے اپنے ملک میں، یا دنیا کی دوسری قوموں میں ماتم کرتا یا ان کا مرنیہ کہتا، یا کم از کم یہی کہنے والا ہوتا کہ افسوس، کیسے اچھے لوگ تھے جو اس حادثہ کے شکار ہو گئے۔ اس کے بجائے، چونکہ دنیا اُن کے ظلم سے تنگ آئی ہوئی تھی، اس لیے ان کے عبرتناک انجام پر ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا، ہر زبان نے ان پر ملامت کی ٹھپکار برسائی، اور جس نے بھی

اور تمہارے لیے نشانی ہے، عادیں، جبکہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر سوا بھیج دی کہ جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔

اور تمہارے لیے نشانی ہے، ثمود میں جب اُن سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے نہ کرو۔ مگر اس تنبیہ پر بھی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ آخر کار ان کے

اس خبر کو سنا وہ بکا ر اٹھا کہ یہ ظالم اسی انجام کے مستحق تھے۔ سورہ دُخان میں اسی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ، پھر نہ آسمان ان پر رو دیا اور نہ زمین۔“
(تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ دُخان، حاشیہ ۲۵)

۳۹ اس ہوا کے لیے لفظ عقیق استعمال ہوا ہے جو بانجھ عورت کے لیے بولا جاتا ہے، اور لغت میں اس کے اصل معنی یا بس (خشک) کے ہیں۔ اگر اسے لغوی معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسی سخت گرم و خشک ہوا تھی کہ جس چیز پر سے وہ گزر گئی اُسے مسکھا کر رکھ دیا۔ اور اگر اسے محاورے کے مفہوم میں لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ بانجھ عورت کی طرح وہ ایسی ہوا تھی جو اپنے اندر کوئی نفع نہ رکھتی تھی۔ نہ خوشگوار تھی، نہ بارش لانے والی، نہ درختوں کو بار آور کرنے والی، اور نہ اُن فائدوں میں سے کوئی فائدہ اُس میں تھا جن کے لیے ہوا کا چلنا مطلوب ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ یہ صرف بے خیر اور خشک ہی نہ تھی بلکہ نہایت شدید آندھی کی شکل میں آئی تھی جس نے لوگوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ دیا، اور یہ مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک چلتی رہی، یہاں تک کہ قوم عاد کے پورے علاقے کو اس نے تہس نہس کر کے رکھ دیا (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ غم السجدہ، حواشی نمبر ۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰)

یہ مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون سی مہلت ہے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ سورہ ہود کی اُس آیت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ثمود کے لوگوں نے جب حضرت صالح کی اونٹنی کو ہلاک کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کر دیا گیا کہ تین دن تک مزے نہ کرو، اس کے بعد تم پر عذاب آجائے گا۔ بخلاف اس کے حضرت حسن بصری کا خیال ہے کہ یہ بات

دیکھتے دیکھتے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب نے اُن کو آیا، پھر نہ اُن میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے۔

اور ان سب پہلے ہم نے نوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے۔
آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔ زمین کو ہم نے

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی دعوت کے آغاز میں اپنی قوم سے فرمائی تھی اور اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم توبہ و ایمان کی راہ اختیار نہ کرو گے تو ایک خاص وقت تک ہی تم کو دنیا میں عیش کرنے کی مہلت نصیب ہو سکے گی اور اس کے بعد تمہاری شامت آجائے گی۔ ان دونوں تفسیروں میں سے دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بعد کی آیت فَعَتَوْا عَنْ أَمْوَاجِ قُبُورِهِمْ انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سترابی کی یہ بتاتی ہے کہ جس مہلت کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ سترابی سے پہلے دی گئی تھی اور انہوں نے سترابی اس تنبیہ کے بعد کی۔ اس کے برعکس سورہ ہود والی آیت میں تین دن کی جس مہلت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان ظالموں کی طرف سے آخری اور فیصلہ کن سترابی کا ارتکاب ہو جانے کے بعد دی گئی تھی۔

۱۱۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں اسے رَجْفٌ دہلا دینے والی اور ہلکانے والی آفت، کہا گیا ہے۔ کہیں اس کو صُنْبُجٌ دھماکے اور کڑکے، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہیں اس کے لیے طاعنہ دانتہائی شدید آفت، کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہاں اسی کو صاعقہ کہا گیا ہے جس کے معنی بجلی کی طرح اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کے بھی ہیں اور سخت کڑک کے بھی۔ غالباً یہ عذاب ایک ایسے زلزلے کی شکل میں آیا تھا جس کے ساتھ خوفناک آواز بھی تھی۔

۱۲۔ اصل الفاظ ہیں مَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ۔ انتصار کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے حملہ سے بچانا۔ اور دوسرے معنی ہیں حملہ کرنے والے سے بدلہ لینا۔

بچایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہمارا کرنے والے ہیں۔ اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو۔ پس دُورِ اللہ کی طرف، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف ۳۳۱ آخرت کے حق میں تاریخی دلائل پیش کرنے کے بعد اب پھر اسی کے ثبوت میں آفاقی دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔

۳۳۲ اصل الفاظ ہیں وَ اِنَّا لَمُوسِعُونَ۔ موسیع کے معنی طانت و مقدرت رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں اور وسیع کرنے والے کے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمان ہم نے کسی کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے زور سے بنایا ہے اور اس کی تخلیق ہماری مقدرت سے باہر نہ تھی۔ پھر یہ تصور تم لوگوں کے دماغ میں آخر کیسے آگیا کہ ہم تمہیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ مسلسل اس میں توسیع کر رہے ہیں اور ہر آن اس میں ہماری تخلیق کے نئے نئے کوشے رونما ہو رہے ہیں۔ ایسی زبردست خلاق ہستی کو آخر تم نے اعادۂ خلق سے عاجز کیوں سمجھ رکھا ہے؟

۳۳۵ اس کی تشریح حاشیہ ۱۸ میں گزر چکی ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۵۹۰ تا ۵۹۲۔ جلد چہارم، تفسیر سورہ یس، حاشیہ ۲۹۔ الزخرف، حواشی ۷ تا ۱۰۔

۳۳۶ یعنی دنیا کی تمام اشیاء ترویج کے اصول پر بنائی گئی ہیں۔ یہ سارا کارخانہ عالم اس قاعدے پر چل رہا ہے کہ بعض چیزوں کا بعض چیزوں سے جوڑ بگتا ہے اور پھر اُن کا جوڑ لگنے ہی سے طرح طرح کی ترکیبات وجود میں آتی ہیں۔ یہاں کوئی شے بھی ایسی منفرد نہیں ہے کہ دوسری کوئی شے اس کا جوڑ نہ ہو، بلکہ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، یس، حاشیہ ۳۱۔ الزخرف، حاشیہ ۱۲۔

۳۳۷ مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کا ترویج کے اصول پر بنایا جانا، اور دنیا کی تمام اشیاء کا ترویج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو آخرت کے وجوب پر صریح شہادت دے رہی ہے اگر تم غور کرو تو اس سے خود تمہاری عقل یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز کا ایک جوڑا ہے، اور کوئی چیز

خبردار کرنے والا ہوں۔ اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔

اپنے جوڑے سے ملے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتی، تو دنیا کی یہ زندگی کیسے بے جوڑ ہو سکتی ہے؟ اس کا جوڑا لازماً آخرت ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ قطعاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

آگے کے مضمون کو سمجھنے کے لیے اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ یہاں تک ساری بحث آخرت کے موضوع پر چلی آرہی ہے، لیکن اسی بحث اور انہی دلائل سے توحید کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ بارش کا انتظام، زمین کی ساخت، آسمان کی تخلیق، انسان کا اپنا وجود، کائنات میں قانونِ تزویج کی حیرت انگیز کار فرمائی، یہ ساری چیزیں جس طرح آخرت کے امکان و وجوب پر گواہ ہیں اُسی طرح یہ اس بات کی شہادت بھی دے رہی ہیں کہ یہ کائنات نہ بے خدا ہے اور نہ اس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ ایک خدائے حکیم و قادر مطلق ہی اس کا خالق اور مالک اور مدبر ہے۔ اس لیے آگے انہی دلائل کی بنیاد پر توحید کی دعوت پیش کی جا رہی ہے۔ علاوہ بریں آخرت کو ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا سے بغاوت کا روٹیہ چھوڑ کر اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کرے۔ وہ خدا سے اُسی وقت تک پہرا رہتا ہے جب تک وہ اس غفلت میں مبتلا رہتا ہے کہ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال کا کوئی حساب مجھے کسی کو دینا نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی جس وقت بھی رفع ہو جائے، اس کے ساتھ ہی فردِ آدمی کے ضمیر میں یہ احساس ابھر آتا ہے کہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر وہ بڑی بھاری غلطی کر رہا تھا اور یہ احساس اُسے خدا کی طرف پلٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر آخرت کے دلائل ختم کرتے ہی معا بعد یہ فرمایا گیا ”پس وہ اللہ کی طرف“۔

۴۸؎ یہ فقرے اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہیں مگر ان میں متکلم اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا بات دراصل یوں ہے کہ اللہ اپنے نبی کی زبان سے یہ کہلوایا ہے کہ وہ اللہ کی طرف، میں تمہیں اُس کی طرف سے خبردار کرتا ہوں۔ اس طرزِ کلام کی مثال قرآن کی اولین سورۃ، یعنی سورۃ فاتحہ میں موجود ہے جس میں کلام تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مگر متکلم کی حیثیت سے بندے عرض کرتے ہیں: اِيَّاكَ نَعْبُدُ

یونہی بتا رہا ہے، ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔^{۶۹} کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ بنیں۔ پس اُسے نبی، ان سے رخ پھیرو، تم پر کچھ ملامت نہیں۔^{۷۰} وَإِيَّاكَ فَتُخَدِّعُ، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ جس طرح وہاں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ ”اے اہل ایمان تم اپنے رب سے یوں دعا مانگو، مگر فحوائے کلام سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ ایک دعا ہے جو اللہ اپنے بندوں کو سکھا رہا ہے، اُسی طرح یہاں بھی یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ”اے نبی تم ان لوگوں سے کہو، مگر فحوائے کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ توحید کی ایک دعوت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بنی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ سورہ فاتحہ کے علاوہ اس طرزِ کلام کی اور بھی متعدد نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں کلام تو اللہ ہی کا ہوتا ہے مگر متکلم کہیں فرشتے ہوتے ہیں اور کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس امر کی تصریح کے بغیر کہ یہاں متکلم کون ہے، سیاق عبارت سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ اپنا یہ کلام کس کی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورہ مریم ۶۴-۶۵۔ التَّائِبَاتِ ۱۵۹ تا ۱۶۷۔ الشوریٰ ۱۰۔

^{۶۹} یعنی آج پہلی مرتبہ ہی یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی زبان سے آخرت کی خبر اور توحیدِ الہ کی دعوت سن کر لوگ اسے ساحر اور مجنون کہہ رہے ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب سے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے رسول آنے شروع ہوئے ہیں، آج تک جاہل لوگ اسی ایک حماقت کا پوری کیسانی کے ساتھ اعادہ کیے چلے جا رہے ہیں جس رسول نے بھی آکر خبردار کیا کہ تم بہت سے خداؤں کے بندے نہیں ہو بلکہ صرف ایک ہی خدا تمہارا خالق و معبود اور تمہاری قسمتوں کا مالک و مختار ہے، جاہلوں نے شور مچا دیا کہ یہ جا دو گر ہے جو اپنے افسوں سے ہماری عقلوں کو بگاڑنا چاہتا ہے جس رسول نے بھی آکر خبردار کیا کہ تم غیر ذمہ دار بنا کر دنیا میں نہیں چھوڑ دیئے گئے ہو بلکہ اپنا کارنامہ حیات ختم کرنے کے بعد تمہیں اپنے خالق و مالک کے سامنے حاضر ہو کر اپنا حساب دینا ہے اور اس حساب کے نتیجہ میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانی ہے، نادان لوگ چیخ اٹھے کہ یہ پاگل ہے، اس کی عقل ماری گئی ہے، بھلا مرنے

کے بعد ہم کہیں دوبارہ بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔

۱۵۔ یعنی یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہزار ہا برس تک ہر زمانے میں مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگوں کا دعوتِ انبیاء کے مقابلے میں ایک ہی رویت اختیار کرنا، اور ایک ہی طرح کی باتیں اُن کے خلاف بنانا کچھ اس بنا پر تو نہ ہو سکتا تھا کہ ایک کافر نس کر کے ان سب اگلی اور پچھلی نسلوں نے آپس میں یہ طے کر لیا ہو کہ جب کوئی نبی آکر یہ دعوت پیش کرے تو اس کا یہ جواب دیا جائے۔ پھر اُن کے رویتے کی یہ کیانی اور ایک ہی طرزِ جواب کی یہ مسلسل تکرار کیوں ہے؟ اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ طغیان و سرکشی ان سب کا مشترک وصف ہے۔ چونکہ ہر زمانے کے جاہل لوگ خدا کی بندگی سے آزاد اور اُس کے تعاسب سے بے خوف ہو کر دنیا میں تشریفِ مہار کی طرح جینے کے خواہاں رہے ہیں، اس لیے اور صرف اسی لیے جس نے بھی اُن کو خدا کی بندگی اور خدا ترسانہ زندگی کی طرف بلایا اس کو وہ ایک ہی گناہ کا جواب دیتے رہے۔

اس ارشاد سے ایک اور اہم حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ منکالت اور ہدایت نیکی اور بدی، ظلم اور عدل اور ایسے ہی دوسرے اعمال کے جو محرکات نفسِ انسانی میں باطنِ موجود ہیں اُن کا ظہور ہمیشہ ہر زمانے میں اور زمین کے ہر گوشے میں ایک ہی طرح ہوتا ہے، خواہ فرائض و مسائل کی ترقی سے اس کی شکلیں بظاہر کتنی ہی مختلف نظر آتی ہوں۔ آج کا انسان خواہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں اور ہائیڈروجن بموں کے ذریعہ سے ٹرے اور قدیم زمانے کا انسان چاہے پتھروں اور لٹھیوں سے لڑتا ہو، مگر انسانوں کے درمیان جنگ کے بنیادی محرکات میں سرِ مؤ فرق نہیں آیا ہے۔ اسی طرح آج کا ملحد اپنے الحاد کے لیے دلائل کے خواہ کتنے ہی انبار لگاتا رہے، اُس کے اس راہ پر جانے کے محرکات بعینہ وہی ہیں جو آج سے ۶ ہزار برس پہلے کے کسی ملحد کو اس طرف لے گئے تھے اور بنیادی طور پر وہ اپنے استدلال میں بھی اپنے سابق پیشواؤں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

۱۶۔ اس آیت میں دین کی تبلیغ کا ایک قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایک داعیِ حق جب کسی شخص کے سامنے معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوتِ صاف صاف پیش کر دے اور

البتہ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے۔

اس کے شبہات و اغترافات اور دلائل کا جواب بھی دے دے تو حق واضح کرنے کا جو فرض اس کے ذمے تھا اس سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ شخص اپنے عقیدہ و خیال پر جابر ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری داعی حق پر عائد نہیں ہوتی۔ اب کچھ ضرور نہیں کہ وہ اُسی شخص کے پیچھے پڑا رہے، اُسی سے بحث میں اپنی عمر کھپائے چلا جائے، اور اس کا کام بس یہ رہ جائے کہ اُس ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنا دے۔ داعی اپنا فرض ادا کر چکا۔ وہ نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اس کی طرف التفات نہ کرنے پر داعی کو یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ تم نے ایک آدمی کو گمراہی میں مبتلا رہنے دیا، کیونکہ اب اپنی گمراہی کا وہ شخص خود ذمہ دار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ قاعدہ اس لیے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ معاذ آپ اپنی تبلیغ میں بیجا طریقے سے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے روکنا چاہتا تھا۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک داعی حق جب کچھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے کا حق ادا کر چکتا ہے اور ان کے اندر ضد اور جھگڑا لوہن کے آثار دیکھ کر اُن سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس پر الزام رکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ واہ صاحب، آپ اچھے دعوتِ حق کے علمبردار ہیں، ہم آپ سے بات سمجھنے کے لیے بحث کرنا چاہتے ہیں، اور آپ ہماری طرف التفات نہیں کرتے۔ حالانکہ اُن کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں بلکہ اپنی بھٹائی میں داعی کو الجھانا اور محض اس کی تضحیک اوقات کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلامِ پاک میں بالفاظِ صریح یہ فرما دیا کہ ”ایسے لوگوں کی طرف التفات نہ کرو اُن سے بے اتفاقی کرنے پر تمہیں کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی“ اس کے بعد کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ الزام نہیں دے سکتا تھا کہ جو کتاب آپ لے کر آئے ہیں اس کی رو سے تو آپ ہم کو اپنا دین سمجھانے پر مامور ہیں، پھر آپ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

۲۵ اس آیت میں تبلیغ کا دوسرا قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ دعوتِ حق کا اصل مقصد اُن

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ میں اُن سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ اللہ

سعید روحوں تک ایمان کی نعمت پہنچانا ہے جو اس نعمت کی قدر شناس ہوں اور اُسے خود حاصل کرنا چاہیں۔ مگر داعی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے ہزاروں لاکھوں افراد میں وہ سعید ہیں کہاں ہیں۔ اس لیے اُس کا کام یہ ہے کہ اپنی دعوتِ عام کا سلسلہ برابر جاری رکھے تاکہ جہاں جہاں بھی ایمان قبول کرنے والے افراد موجود ہوں وہاں اس کی آواز پہنچ جائے۔ یہی لوگ اس کی اصل دولت ہیں۔ انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے۔ اور انہی کو سمیٹ سمیٹ کر خدا کے راستے پر لاکھڑا کرنا اس کے پیش نظر ہونا چاہیے۔ بیچ میں اولادِ آدم کا جو فضول عنصر اس کو ملے اُس کی طرف بس اسی وقت تک داعی کو توجہ کرنی چاہیے جب تک اُسے تجربے سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جنس کا سد ہے۔ اُس کے کساد و فنا کا تجربہ ہو جانے کے بعد اُسے پھر اپنا قیمتی وقت اس جنس کے لوگوں پر ضائع نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ اُس کی تذکیر سے نفع اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں، اور ان پر اپنی قوت صرف کرنے سے نقصان اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو اس سے نفع اٹھانے والے ہیں۔

۵۳ یعنی میں نے ان کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ میری بندگی تو ان کو اس لیے کرنی چاہیے کہ میں ان کا خالق ہوں۔ دوسرے کسی نے جب ان کو پیدا نہیں کیا تو اُس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ یہ اس کی بندگی کریں، اور ان کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ان کا خالق تو ہوں میں اور یہ بندگی کرتے پھر دوسروں کی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف جنوں اور انسانوں ہی کا خالق تو نہیں ہے بلکہ سارے جہان اور اس کی ہر چیز کا خالق ہے، پھر یہاں صرف جنوں اور انسانوں ہی کے متعلق کیوں فرمایا گیا کہ میں نے ان کو اپنے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟ حالانکہ مخلوقات کا ذوق و اشتہا ہی کی بندگی کے لیے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر صرف جن اور انسان ایسی مخلوق ہیں جن کو یہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے دائرہ اختیار میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہیں تو کریں، ورنہ وہ بندگی

سے مُنہ بھی موڑ سکتے ہیں، اور اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی بھی کر سکتے ہیں۔ دوسری جتنی مخلوقات بھی اس دنیا میں ہیں وہ اس نوعیت کی کوئی آزادی نہیں رکھتیں۔ اُن کے لیے سرے سے کوئی دائرہ اختیار ہے ہی نہیں کہ وہ اس میں اللہ کی بندگی نہ کریں یا کسی اور کی بندگی کر سکیں۔ اس لیے یہاں صرف جنوں اور انسانوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کے حدود میں اپنے خالق کی اطاعت و عبودیت سے مُنہ موڑ کر، خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے خود اپنی فطرتِ زبے ہیں، اُن کو یہ جاننا چاہیے کہ وہ خالق کے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں اور ان کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ جو آزادی نہیں بخشی گئی ہے اسے غلط استعمال نہ کریں بلکہ اس آزادی کے حدود میں بھی خود اپنی مرضی سے اسی طرح خدا کی بندگی کریں جس طرح اُن کے جسم کا روگٹا روگٹا ان کی زندگی کے غیر اختیاری حدود میں بھی بندگی کر رہا ہے۔ عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز روزے اور اسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے کہ جن اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح و تہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ مفہوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے، مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرمانبرداری اور نیاز مندی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجا لانا کسی اور سے تعقیب کرنا، کسی اور کے بنائے ہوئے دین کی پیروی کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنے والا سمجھنا۔ اور کسی دوسری بستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتا نہیں ہے۔ دغیر تشریح کیلئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ بآ، حاشیہ ۶۲۔ الزمر، حاشیہ ۲۔ الباقیہ حاشیہ ۳

ایک اور بات جو ضمنی طور پر اس آیت سے صاف ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جن انسانوں سے الگ ایک مستقل مخلوق ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو قرآن میں جن کہا گیا ہے۔ اسی حقیقت پر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات بھی ناقابل انکار شہادت بہم پہنچاتی ہیں: الانعام، ۱۰۰، ۱۲۸۔ الاعراف، ۳۸، ۱۷۹۔ ہود، ۱۱۹۔ البقرہ، ۲۷ تا ۳۳۔ بنی اسرائیل، ۸۸۔ الکہف، ۵۰۔ السجده، ۱۳۔ سبا، ۴۱۔ ص، ۷۵، ۷۶۔ حم السجده، ۲۵۔ الاحقاف، ۱۸۔ الرحمن، ۱۵، ۳۹، ۵۶۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن،

تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا اور زبردست۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے اُن کے حصّے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسا انہی جیسے لوگوں کو ان کے حصّے کا مل چکا ہے، اس کے لیے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں۔ آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لیے اُس روز جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے۔

جلد سوم، ص ۱۷۷-۱۷۸-۵۶۲-۵۶۳-۵۷۵-۵۷۶-جلد چہارم، تفسیر سورہ سبا، حاشیہ ۱۲۴

۵۵ یعنی میری کوئی غرض جنوں اور انسانوں سے اُٹتی ہوئی نہیں ہے کہ یہ میری عبادت کر چکے تو میری خدائی چلے گی اور یہ میری بندگی سے منہ موڑ لینگے تو میں خدا نہ رہوں گا۔ میں ان کی عبادت کا محتاج نہیں ہوں بلکہ میری عبادت کرنا خود ان کی اپنی فطرت کا تقاضا ہے، اسی کے لیے یہ پیدا کیے گئے ہیں اور اپنی فطرت سے اُڑنے میں ان کا اپنا نقصان ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ میں ان رزق نہیں چاہتا اور یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، اس میں ایک لطیف تعریف ہے۔ خدا سے برگشتہ لوگ دنیا میں جن جن کی بندگی بجا رہے ہیں، وہ سب درحقیقت اپنے ان بندوں کے محتاج ہیں۔ یہ اُن کی خدائی نہ چلا میں تو ایک دن بھی وہ نہ چلے۔ وہ ان کے رزق نہیں بلکہ اُن کے لیے یہ اُن کو رزق پہنچاتے ہیں۔ وہ ان کو نہیں کھلاتے بلکہ اُن کے لیے یہ اُن کو کھلاتے ہیں۔ وہ ان کی جان کے محافظ نہیں بلکہ اُن کے لیے یہ اُن کی جانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کے لشکر یہ ہیں جن کے بل پر اُن کی خدائی چلتی ہے۔ جہاں بھی ان جھوٹے خداؤں کی حمایت کرنے والے بندے رہے، یا بندوں نے ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا وہاں ان کے سب ٹھاٹھ پڑے رگڑے اور دنیا کی آنکھوں نے اُن کی کس میرسی کا حال دیکھ لیا۔ سارے معبودوں میں اکیلا ایک اللہ جلّ شانہ ہی وہ حقیقی معبود ہے جس کی خدائی اپنے بل بوتے پر چل رہی ہے، جو اپنے بندوں سے کچھ لیتا نہیں بلکہ وہی اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے۔

۵۵ اصل میں نقطہ متین استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں مضبوط اور غیر متزلزل، جسے کوئی ہلانا نہ سکتا ہو۔

۵۶ ظلم سے مراد یہاں حقیقت اور صداقت پر ظلم کرنا، اور خود اپنی فطرت پر ظلم کرنا ہے۔ یہاں و سابق خود تبارک و تعالیٰ پر ظلم کرنے والوں کے وہ لوگ مراد ہیں جو خداوند عالم کے سوا دوسروں کی بندگی کر رہے ہیں، جو آخرت کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو دنیا میں غیر ذمہ دار سمجھ رہے ہیں اور اُن انبیاء کو جھٹل رہے ہیں جنہوں نے اُن کو حقیقت خبردار کرنے کی کوشش کی ہے۔

۵۷ یہ جواب ہے کفار کے اس مطالبہ کا کہ وہ یوم الجزا کہاں آتے آتے رہ گیا ہے آخر وہ آئیوں نہیں جاتا۔